

میرزا ادیب

سال ولادت: ۱۹۱۴ء

سال وفات: ۱۹۹۹ء

میرزا ادیب کا اصلی نام دلاور علی اور قلمی نام میرزا ادیب ہے۔ ۱۹۳۱ء میں اسلامیہ ہائی سکول بھائی گیٹ سے میٹرک کرنے کے بعد انھوں نے ۱۹۳۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے آنرز کیا۔ ۱۹۴۰ء میں ان کی شادی ہوئی۔ بچپن ہی سے ان کا لگاؤ شعر و ادب سے تھا۔ یوں سکول کے زمانہ ہی سے ان میں ادبی رجحان فروغ پا رہا تھا۔

میرزا ادیب کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۶ء سے ہوا۔ اس زمانے میں اسلامیہ کالج لاہور میں بہت سی علمی و ادبی شخصیتیں موجود تھیں جنھوں نے میرزا کے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں معاونت کی۔ میرزا نے ابتدا میں شعر و شاعری کی طرف توجہ دی مگر جلد ہی اسے ترک کر کے افسانہ اور ڈراما نگاری کی طرف توجہ دی اور اس میں نام پیدا کیا۔

اس زمانے میں رومانوی تحریک عروج پر تھی۔ اس لیے میرزا ادیب نے بھی اسی تحریک کو اپنایا۔ انھوں نے ۱۹۳۵ء میں رسالہ ”ادب لطیف“ کی ادارت سنبھالی اور طویل عرصہ تک اس سے وابستہ رہے۔ پھر ریڈیو پاکستان میں ملازم ہو گئے۔ اسی دوران میں افسانہ نگاری اور ڈراما نگاری کی طرف بھرپور توجہ دیتے رہے۔

میرزا ادیب ایک بانی اور ریڈیائی ڈرامہ نگاری میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد اردو ادب میں ایک ایکٹ کے ڈرامے کو جو فروغ ملا اس میں میرزا ادیب نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ معاشرے کے نفس شناس تھے۔ اس لیے ان کے ڈراموں کے موضوعات عام اور روزمرہ زندگی سے متعلق ہیں۔ اپنے معاشرے کی انسانی خواہشات اور توقعات کو میرزا ادیب نے خاص اہمیت دی ہے۔

میرزا ادیب نے کردار نگاری کے سلسلے میں بھی گہرے مشاہدے اصول بصیرت اور فنکارانہ گرفت سے کام لیا ہے، اس لیے انھوں نے زندگی کے عام کرداروں کو ڈرامائی کرداروں کا درجہ دیا ہے۔ ان کے مکالمے نہایت برجستہ، مختصر اور بر محل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈراموں میں قاری یا ناظر کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے جو کسی کامیاب ڈراما نگار کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ ان کے ڈراموں کے اہم مجموعوں کے نام یہ ہیں۔ ”آنسو اور ستارے“، ”لہو اور قالین“، ”ستون“، ”فصلی شب“، ”خاک نشیں“، ”پس پردہ“ اور ”شخص کی دیوار“۔ ان کے علاوہ ”صحراورد کے خطوط“، ”صحراورد کے رومان“ اور ”مٹی کا دریا“ (آپ بیتی) ان کی زندہ رہنے والی کتابیں ہیں۔

فصل

کردار

جیلہ، ارشاد، منور بیگم، نعیم۔

(جیلہ اور ارشاد مصروف گفتگو ہیں۔ جیلہ ارشاد سے تین چار سال بڑی ہے)

جیلہ: ارشاد! بھئی ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کل آئی تھی تو تم بے حد خوش تھیں مگر آج اس قدر افسردہ ہو کہ طبیعت پریشان ہو گئی ہے۔ معاملہ کیا ہے آخر!

ارشاد: معاملہ کیا بتاؤں جیلہ باجی!

جیلہ: کیوں؟ بتاؤ گی نہیں۔ ایک تو وہ حال کہ فرخندہ کے جہیز کا ذکر کرتے ہوئے تھکتی ہی نہیں تھیں اور آج صورت یہ ہے کہ بچی کے بیاہ کی بات کرتی ہوں تو خاموش ہو جاتی ہو۔

ارشاد: پھر کروں کیا باجی!

جیلہ: اُلجھن کیا ہے آخر!

ارشاد: اُلجھن سی اُلجھن ہے باجی!

جیلہ: بتانے میں کیا حرج ہے؟

ارشاد: حرج کیا ہوگا باجی! منور نے جو حرکت کی ہے میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

جیلہ: منور بیگم؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟

ارشاد: سچ کہتی ہوں باجی! منور نے جو کچھ کیا ہے اس کی توقع شاید ایک دشمن سے بھی نہیں کی جاسکتی۔ میں نے یہ سوچ کر اس کے بیٹے سے اپنی فرخندہ کی منگنی کی تھی کہ میری بچپن کی سہیلی ہے میرا پورا ساتھ دے گی لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس ہے۔

جیلہ: کیا نعیم نے کچھ گڑبڑ کی ہے؟

ارشاد: نعیم کیا گڑبڑ کرے گا۔ بڑا اچھا لڑکا ہے۔

جیلہ: اس کے ابا جان کو اس رشتے پر کچھ اعتراض ہے؟

ارشاد: بالکل نہیں؟

جیلہ: تو پھر میں سمجھتی کہ تمہیں شکایت کس سے ہو سکتی ہے؟

ارشاد: باجی! میں نے کہا نہیں ہے کہ منور نے جو کچھ کیا ہے اس کی توقع کسی دشمن سے بھی نہیں ہو سکتی تھی؟

جیلہ: ذرا تھل سے بات کرو۔ میرا تو خیال ہے کہ فرخندہ کو وہ بہت پسند کرتی ہے۔ کئی بار میں نے اسے تمہاری بچی کو پیار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

ارشاد: پیار ہوتا تو ہم پر ظلم نہ کرتی۔

جیلہ: کیا انکار کر دیا ہے؟

ارشاد: جو کچھ کہا ہے وہ انکار سے بھی بدتر ہے۔

جیلہ: انکار سے بھی بدتر!

ارشاد: ہاں باجی ایاد ہے باجی اس رشتے پر گفتگو سب سے پہلے تم ہی نے کی تھی۔

جیلہ: یقیناً میں نے کی تھی اور منور نے ایسی خوشی کا اظہار کیا تھا جیسے وہ ایک مدت سے ہی اس بات کا انتظار کر رہی تھی۔

ارشاد: کہ مجھے ذلیل کرے۔ اس کے پیش نظر اور کوئی مقصد نہیں تھا۔ باجی! تم جانتی ہو کہ ہم دونوں میں یہ بات بھی ہو چکی ہے کہ آنے والے دسمبر کے آخری دنوں میں شادی ہوگی۔ جہیز قریب قریب مکمل کر لیا ہے۔ سب کو اس کی اطلاع مل چکی ہے۔ اب محترمہ نے بیٹھے بیٹھے یہ مطالبہ کر دیا ہے کہ فرخندہ کے جہیز میں ایک کٹھی بھی شامل ہو۔

جیلہ: کیا؟

ارشاد: لو پڑھو۔ کل شام کے وقت یہ رقعہ ملا تھا۔

جیلہ: (پڑھتے ہوئے) پیاری بہن جیلہ خاتون! میری یہ خواہش نہیں شدید مطالبہ بھی ہے کہ فرخندہ کے جہیز میں ایک کٹھی بھی شامل کرو۔ میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ اس کے بغیر جو جہیز بنے گا وہ ہمیں منظور نہیں ہوگا۔

ارشاد: دیکھا باجی اس قسم کا مطالبہ اور پھر اس صورت میں سوائے دشمن کے اور کون کر سکتا ہے۔

جیلہ: میں تو سمجھتی ہوں کہ کوئی شخص ہوش و خرد کے عالم میں یہ نہیں کر سکتا۔ یہ منور نے رقعہ لکھا ہے؟

ارشاد: اور کس نے لکھا ہے! تمہیں شک ہے!

جیلہ: دکھاؤ نا کاغذ۔ نیچے نام کیا لکھا ہے..... یہ منور کہاں ہے۔ کوئی اور نام ہے۔

ارشاد: ”منجو“ ہے۔

جیلہ: ”منجو“..... یہ کون ہے؟

ارشاد: ہم لوگ اسے منور نہیں منجو کہا کرتے تھے۔

جیلہ: گو یا رقعہ اس نے لکھا ہے۔

ارشاد: اور کس نے لکھا ہے باجی! ایسے لفظ لکھتے ہوئے اُسے کچھ شرم بھی نہیں آئی۔ لے دے کے دو کٹھیاں ہیں ہمارے پاس۔ ایک میں

رہتے ہیں اور دوسری سے جو کرایہ ملتا ہے اس سے گزراوقات کرتے ہیں۔ فرخندہ کے ابا کی جتنی تنخواہ ہے وہ تم جانتی ہو۔ اس تنخواہ سے

گھر کے اخراجات کس طرح پورے ہو سکتے ہیں اور پھر یہ بھی دیکھو، میں صرف فرخندہ کی ماں نہیں ہوں گھر میں بیابنے لائق دو اور بھی

بیٹیاں ہیں۔ اس بیٹی کے جہیز میں کٹھی دے دیں تو باقی دو بیٹیوں کو کیا دیں گے۔ یہ اپنے بیٹے کے لیے کٹھی کا مطالبہ کر رہی ہے تو وہ

ماں باپ کوٹھیاں کیوں مانگیں، جن کے گھروں میں ہماری دوسری دو بیٹیاں جانے والی ہیں۔

جیلہ: ٹھیک کہہ رہی ہوں!

ارشاد: ابھی میں نے فرخندہ کے ابا سے اس رقعے کا ذکر کیا نہیں، کیا کہوں اُن سے! کیا کہیں گے وہ۔ یہ تمہاری پرانی سہیلی ہے۔ بڑا ناز کرتی

تھیں اس پر۔ بہت خوش ہو رہی تھیں یہ رشتہ کر کے۔ اب بتاؤ کیا کہتی ہو تم، باجی! وہ کیا کچھ نہیں کہیں گے؟ کیا کچھ نہیں سوچیں گے؟

اگر ایسا مطالبہ کرنا تھا تو شروع ہی میں انکار کر دیتی۔ مجھے زیادہ شکایت نہ ہوتی بلکہ کوئی شکایت نہ ہوتی لیکن اس وقت کہ سب

عزیزوں، رشتہ داروں کو ظلم ہو چکا ہے کہ میری فرخندہ منور کے گھر جا رہی ہے۔ چند ماہ بعد شادی ہو رہی ہے اس کا یہ مطالبہ کسی طرح

بھی جائز ہے؟

جیلہ: بالکل ناجائز ہے!

ارشاد: (آواز میں جذبات کی شدت سے لرزش) میں کیا منہ دکھاؤں گی لوگوں کو۔ رشتے دار کیسے کیسے طعنہ دیں گے۔ میری بچی کے دل پر کیا گزرے گی۔ باجی! یہ کس کارن ہمارے درپے آزار ہوگئی ہے۔

جیلہ: صریحاً زیادتی کر رہی ہے۔

ارشاد: زیادتی سی زیادتی باجی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہوگا کیا!

جیلہ: ارشاد۔

ارشاد: کہو باجی۔

جیلہ: اس قدر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ارشاد: کیا ابھی کوئی امید کی صورت باقی ہے؟

جیلہ: کیوں نہیں؟ میں اس کے پاس جا رہی ہوں۔ اسے بتاؤں گی۔ امید ہے معقولیت کی راہ اختیار کرے گی۔

ارشاد: اگر نہ کی تو.....

جیلہ: کیوں نہ کرے گی..... مجھے یقین ہے کہ اس نے یہ مطالبہ کسی غلط فہمی کی بنا پر کیا ہے۔

ارشاد: غلط فہمی کیسی؟

جیلہ: میرا مطلب ہے۔ کسی لگائی بھائی کرنے والی عورت کے بھڑے میں آکر۔ جانتی ہو دنیا میں ایک دوست اور دس دشمن ہوتے ہیں۔

بعض لوگوں کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ کسی کو خوش دیکھ ہی نہیں سکتے۔ تم نے اس رقعے کا کوئی جواب تو نہیں دیا۔

ارشاد: جواب کیا دے سکتی تھی۔

جیلہ: بس ٹھیک ہے۔ گفتگو کرتی ہوں ابھی جا کر۔ جب تک لوٹوں کسی سے کچھ کہنا سننا نہیں ہے اور نہ افسوس کرنے کی ضرورت ہے۔

پتا نہیں کیا صورت حال ہے اور کیوں ہے؟ سمجھ لیا نا۔

ارشاد: ہاں۔

جیلہ: ذرا کریم سے کہنا ٹیکسی لے آئے۔

(منظر کی تبدیلی کے لیے موسیقی)

جیلہ: منور! جب میں نے وہ رقعہ پڑھا تو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اس کے لکھنے والی تم ہو۔ یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے منور! حد کر دی

ہے۔ سراسر زیادتی کر رہی ہو۔

منور: نہیں آپا۔

جیلہ: زیادتی نہیں کر رہی تو اور کیا کر رہی ہو۔

منور: یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ کیا کر رہی ہوں مگر زیادتی نہیں کر رہی۔

جیلہ: کمال کر رہی ہو۔ اتنی زیادتی کے بعد بھی کہہ رہی ہو کہ زیادتی نہیں کر رہی۔ تمہیں خبر نہیں ہے کہ ایک کوٹھی کے کرائے سے اُن کے گھر

کا خرچ چلتا ہے۔

منور: ماں باپ اولاد کی خوشی کے لیے قربانی نہیں دیتے!

جمیلہ: اچھا فرض کر لیا جائے کہ وہ اپنی بیٹی کو کوشی دے دیں تو باقی دو بیٹیوں کو کیا ملے گا؟

منور: میرا اس مسئلے سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ اس کی اور اس کے شوہر کی درد سہی ہے میری نہیں۔

جمیلہ: اور تم یہ چاہتی ہو کہ تمہارے بیٹے کو ضرور کوشی دے دی جائے۔

منور: کوشی اس کی بیٹی کی ہوگی میری نہیں۔

جمیلہ: منور معاف کرنا شاید یہ الفاظ تمہیں تلخ لگیں مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ تمہاری اپنی کوئی بیٹی نہیں ہے اس لیے اس طرح سوچ

رہی ہو۔ تمہارے گھر میں بھی بیٹی ہوتی پھر میں دیکھتی کہ کس طرح اپنے بیٹے کے لیے یہ مطالبہ کرتیں۔ بیٹی نہیں ہوئی۔ اس لیے ان

فکروں اور اندیشوں سے آزاد ہو جن میں بیٹیوں والے رات دن گرفتار رہتے ہیں۔ بیٹی کا بوجھ سر پر ہو تو ماں بہت آہستہ آہستہ قدم

اٹھاتی ہے کیوں کہ اس کے راستے میں کانٹے بچھے ہوتے ہیں۔ اگر تمہارا اپنا راستہ ہمارا ہے تو اس ماں کا بھی خیال کرو جس کے

سامنے چاروں طرف بلند پہاڑ کھڑے ہیں۔ اس کا کیا حال ہے۔ اس کا کیا حال ہونے والا ہے۔ یہ بھی سوچ لو۔

منور: مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جمیلہ: اتنی کٹھور ہو چکی ہو۔

منور: جودل میں آئے کہ دو۔ میں بُرا نہیں مانتی۔

جمیلہ: منور!

منور: آپا! اس وقت تم کہہ رہی ہو کہ میں زیادتی کر رہی ہوں۔

جمیلہ: بالکل زیادتی کر رہی ہو۔

منور: اور یہ اس لیے کہ کبھی مجھ پر بھی زیادتی ہوئی تھی۔

جمیلہ: کیا؟

منور: ایک منٹ ٹھہر واپا! (ذرا سا وقفہ) یہ پڑھو۔ آہستہ سے ہاتھ میں لو۔ پُرانا کاغذ ہے۔

جمیلہ: یہ کیا ہے۔ (پڑھتے ہوئے) ”ماں باپ اولاد کی خوشی کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے۔ آپ اپنی بیٹی کو ایک کار دے دیں گے تو کیا قیامت

آجائے گی۔“ یہ ہے کیا؟

منور: یہ رقعہ ارشاد کی ماں نے میری مرحوم ماں کے نام لکھا تھا۔

جمیلہ: کیوں؟

منور: میری معنی ارشاد کے بھائی سے ہو چکی تھی۔ بیاہ کی تیاریاں بڑے زور شور سے ہو رہی تھیں کہ یہ رقعہ آ گیا۔

جمیلہ: اس میں ارشاد کا کیا قصور؟

منور: یہ رقعہ ارشاد ہی نے انتہائی اصرار کر کے اپنی ماں سے لکھوایا تھا کیوں کہ ان دنوں ایک دولت مند لڑکی اس کی نئی سہیلی بنی تھی اور اس

دولت مند سہیلی کی چھوٹی بہن کنواری تھی۔ ارشاد چاہتی تھی کہ اس کے بھائی کی شادی وہیں ہو۔

جمیلہ: ہیں!

منور: آپا! جب یہ رقعہ ابا اور امی نے پڑھا تو ان کی جو حالت ہوئی بیان نہیں کر سکتی۔ اب بھی ان کے انتہائی افسردہ، پشیمردہ، دکھی، غم دیدہ

چہرے یوں آنکھوں کے سامنے آتے ہیں تو میں کانپ اٹھتی ہوں۔ ان دنوں ہمارے گھر کی حالت بہت خراب تھی۔ بڑی مشکل سے گزارا ہوتا تھا۔ پندرہ بیس ہزار کی کار کہاں سے آتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رشتہ ٹوٹ گیا اور یہی بات تو ارشاد چاہتی تھی۔ آپا تم کہتی ہو میں ارشاد پر زیادتی کر رہی ہوں۔ سوچو اس وقت اسے خیال نہ آیا ”منجو“ جس پر ظلم کر رہی ہے اس کی بچپن کی سہیلی ہے۔ اس کے ساتھ سکول میں پڑھ چکی ہے۔ جس کے ذکھ کو وہ اپنا ذکھ درد جس کی خوشی کو وہ اپنی خوشی سمجھتی رہی ہے۔ اسے خیال نہ آیا کہ بچاری منجو کا کیا حال ہوگا۔ اس کے غریب ماں باپ کا کیا حال ہوگا۔ اس نے یہ نہ سوچا کہ زندگی کا راستہ ہمیشہ ہموار نہیں رہتا۔ اس میں اچانک بڑے گہرے کھڈا جاتے ہیں۔ اس راہ پر پھول ہی نہیں اُگتے۔ کانٹے بھی نکل آتے ہیں۔ آپا! میں کچھ نہیں کر رہی۔ جو کچھ کر رہی ہے منجو کر رہی ہے۔ وہ منجو جسے آج سے تیرہ چودہ برس پہلے اُس نے ٹھکرا دیا تھا۔ جورات رات بھر روتی رہی تھی۔ جس نے اپنی بدنصیب ماں کو اپنے فکر مند باپ کو آہیں بھرتے دیکھا تھا۔ وہ منجو میرا تعاقب کرتی رہی ہے۔ اور اسی نے مجھے ایک طرف ہٹا کر یہ رقعہ لکھا ہے۔

(منور در جذبات میں دو تین لمحوں کے لیے خاموش ہو جاتی ہے)

جمیلہ: منور بہن! مجھے اس واقعے کا کوئی علم نہیں تھا۔

منور: وہ کیوں بتاتی تھیں!

جمیلہ: حیرت ہے اپنی بیٹی کی منگنی تمہارے بیٹے سے کرتے ہوئے وہ بھول گئی کہ وہ تم پر یہ ظلم کر چکی ہے۔

منور: میں یہ بھی بھول جانا چاہتی تھی اور بھول گئی تھی۔ اللہ نے مجھے سب کچھ دے دیا ہے۔ ایک نیک طینت شوہر جو میری ہر بات مان لیتا ہے۔ ایک اطاعت شعار بیٹا جسے دیکھتی ہوں تو اپنی آغوش تربیت پر فخر ہوتا ہے لیکن جب تنہا ہوتی ہوں تو ”منجو“ نہ جانے کہاں سے نکل کر چپ چاپ سامنے آ جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں۔ سر جھکا ہوا ہے۔ سر سے پاؤں تک وہ مجھے مظلومیت کی تصویر نظر آتی ہے۔ اور.....

جمیلہ: اسے معلوم ہونا چاہیے۔ مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا منور..... اور کچھ نہیں کہنا۔

(ذرا سا وقفہ)

منور: (ذرا بلند آواز سے) نعیم بیٹا!

نعیم: جی امی جان!

منور: کیا ابھی ابھی باہر سے آرہے ہو۔

نعیم: جی ہاں، فرمائیے۔

منور: نعیم بیٹا! میں آج کچھ کہنا چاہتی ہوں تم سے۔

نعیم: امی! آپ یہ الفاظ کہہ کر مجھے شرمسار کر رہی ہیں۔ آپ مجھے حکم دیں آپ کے کسی حکم پر میں چون و چرا نہیں کر سکتا۔

منور: مجھے اپنے اطاعت شعار بیٹے سے یہی توقع ہے۔ بیٹا! قصہ یہ ہے کہ تمہاری منگنی ٹوٹ گئی ہے۔

نعیم: ٹوٹ گئی ہے۔

منور: میں نے تو زدی ہے۔

نعیم: اچھا امی جان۔

منور: نہیں..... کچھ..... میرا مطلب ہے.....

نعیم: امی جان! آپ جو کچھ کریں گی اس پر میں کبھی اعتراض کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ صرف ایک دو باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔

منور: کہو!

نعیم: یہ رشتہ اس لیے ختم کر دیا گیا ہے کہ جن لوگوں کو آپ میری سرال بنانا چاہتی تھیں وہ کوٹھی کا مطالبہ پورا نہ کر سکے۔

منور: ہاں

نعیم: اور یہ بھی کہ آپ نے ان سے کوٹھی کا مطالبہ اس لیے کیا ہے کہ انھوں نے میرے نانائانی سے کار کا مطالبہ کیا تھا۔

منور: یہ باتیں تمہیں کہاں سے معلوم ہوئیں؟

نعیم: امی! میں ابھی ابھی خالہ جان کے گھر سے آیا ہوں۔ انھوں نے ذکر کیا تھا مگر مجھے ان سے کیا امی! میرا فرض تو آپ کا حکم ماننا ہی ہے۔

میں آپ کے ہر حکم کو اپنے ایمان کا جزو سمجھتا ہوں۔

منور: اللہ کرے تمہیں زندگی کی ساری خوشیاں حاصل رہیں۔ ہمیشہ سکھی رہو۔ جارہے ہو نعیم! جاؤ۔

(ذرا سا وقفہ)

منور: کیوں نعیم! لوٹ آئے کیا بات ہے؟

نعیم: امی! آئندہ آپ میرے رشتے کی بات چیت کبھی نہ کریں۔

منور: وہ کیوں؟

نعیم: میں شادی نہیں کراؤں گا۔

منور: شادی نہیں کراؤ گے؟

نعیم: جی امی جان! اس کی وجہ یہ ہے! میں ایک لڑکی کو کسی گناہ، جرم اور قصور کے بغیر سزا دینے کے بعد مناسب نہیں سمجھتا کہ کسی اور گھر کے

دروازے پر دستک دی جائے۔ اگر بے گناہوں کو ذاتی انتقام کی آگ میں جھونک دینے کا سلسلہ چل نکلا تو ہر طرف شعلے ہی شعلے بھڑک

اٹھیں گے۔ کرے کوئی اور بھرے کوئی کی روایت نہ جانے کتنے گھروں کا سکون ٹوٹ لے گی۔ کتنے گھر تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ امی

جان! میں جو کچھ کہ رہا ہوں وہ شاید گستاخی ہے لیکن آپ نے ہی تو مجھے سبق دیا ہے کہ بیٹا! ہمیشہ سچ بولو میں آپ کی نصیحت پر عمل

کر رہا ہوں۔ اچھا امی جان!

(وقفہ)

ارشاد: کون ہے؟

منور: دروازہ کھولو۔

ارشاد: منور!..... تم۔ میرے گھر پر!

منور: ہاں تمہارے گھر پر۔

ارشاد: باجی جیلہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے..... اور میں سمجھ چکی تھی کہ اب ہم دونوں گھروں میں ہزاروں لاکھوں میلوں کی دوری آپ کی

ہے۔

منور: یہ دوری منجھو نے پیدا کی تھی۔

ارشاد: تو اب۔

منور: وہ اپنی ساری ذوریاں، سارے فاصلے، ساری کدورتیں لے کر چلی گئی ہے۔ اب نہیں آئے گی۔
 ارشاد: مگر مجھے کچھ دے گئی ہے۔

منور: کیا؟

ارشاد: ندامت کے آنسو جو میری آنکھوں سے بہ رہے ہیں۔

منور: ارشاد بہن! ان آنسوؤں کو پونچھ ڈالو۔

ارشاد: نہیں تم یہ افسوس قبول کرو۔

منور: میں کیا قبول کروں۔ میری تو اپنی آنکھوں میں شرمندگی کے آنسو چھلک رہے ہیں۔

ارشاد: اچھا ہوا یہ آنسو بہ گئے۔ ان کے ساتھ نفرت، انتقام، خود غرضی کی کثافت بھی بہ گئی ہے۔

منور: ارشاد بہن!

ارشاد: منور بہن!

(انتقام)

(”تحریریں“ لاہور _____ اکتوبر، نومبر ۱۹۷۱ء)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں۔

i- ارشاد پریشان کیوں تھی؟

ii- منور نے کیا کیا تھا جس کی توقع دشمن سے بھی نہیں ہو سکتی؟

iii- منور نے رقتے میں کیا لکھا تھا؟

iv- منور اپنی زیادتی کو زیادتی کیوں نہیں سمجھ رہی تھی؟

v- جمیلہ کو کس واقعہ کا علم نہیں تھا؟

2- درست جوابات کے گرد دائرہ لگائیں:

i- ”فاصلے“ کا مصنف کون ہے؟

ا۔ امتیاز علی تاج ب۔ میرزا ادیب ج۔ آغا حشر د۔ حکیم احمد شجاع

ii- میرزا ادیب کی وجہ شہرت زیادہ تر کیا ہے؟

ا۔ مضمون نگاری ب۔ افسانہ نگاری ج۔ تنقید نگاری د۔ ڈراما نگاری

iii- میرزا ادیب کا تعلق کس شہر سے تھا؟

ا۔ سیالکوٹ سے ب۔ لاہور سے ج۔ کوہرانوالا سے د۔ راولپنڈی سے

- 3- ڈراما ”فاصلے“ کا مرکزی خیال لکھیں۔
- 4- ڈراما ”فاصلے“ کا خلاصہ لکھیں۔
- 5- میرزا ادیب پر مختصر سوانحی و تنقیدی نوٹ لکھیں۔
- 6- ”میرزا ادیب اپنے ڈراموں میں عام زندگی کے کرداروں کی باہمی کشمکش کو موضوع بناتے ہیں“۔ ڈراما ”فاصلے“ کے ایک اہم کردار پر مختصر نوٹ لکھیں۔
- 7- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں:
 - i- منور نے جو کچھ کیا ہے اس کی توقع شاید ایک دشمن سے بھی نہیں کی جاسکتی۔
 - ii- میں تو سمجھتی ہوں کہ کوئی شخص ہوش و خرد کے عالم میں یہ نہیں کر سکتا۔
 - iii- اگر تمہارا اپنا راستہ ہموار ہے تو اس ماں کا بھی خیال کرو جس کے سامنے چاروں طرف بلند پہاڑ کھڑے ہیں۔
 - iv- کرے کوئی اور بھرے کوئی کی روایت نہ جانے کتنے گھروں کا سکون لوٹ لے گی۔
 - v- اچھا ہوا یا آئینہ سب گئے، ان کے ساتھ نفرت، انتقام، خود غرضی کی کثافت بھی بگنی ہے۔

☆☆.....☆☆.....☆☆

مضمون

مضمون نثر کی وہ صنف ہے جس میں کسی خاص موضوع پر اپنے جذبات و احساسات اور خیالات کو مبسوط و مربوط انداز میں قلم بند کیا گیا ہو۔ مضمون نگار کے لیے لازم ہے کہ وہ جس موضوع پر مضمون لکھ رہا ہے سب سے پہلے اس کے بارے میں ضروری علمی مواد جمع کرے پھر اس مواد کو مختلف پیرا گراف میں تقسیم کر کے پیش کرے۔ پہلے اپنے موضوع کا تعارف کرائے پھر ان دلائل و براہین کو پیش کرے جو اس کے موضوع کی حمایت یا مخالفت میں ہوں اور آخر میں کوئی نتیجہ برآمد کرے۔

مضمون جس نوعیت کا ہو زبان بھی ویسی ہی لکھنی چاہیے۔ اگر مضمون سائنسی تاریخی یا مذہبی نوعیت کا ہو تو ان علوم و فنون کی مروجہ اصطلاحات و ترکیب کا استعمال ہونا چاہیے۔ اسی طرح تاثراتی یا بیانیہ نوعیت کے مضامین یا طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کی زبان آسان اور سادہ ہونی چاہیے تاکہ ہر ذہن کا قاری ان سے لطف اندوز ہو سکے۔ شاعرانہ زبان صرف تاثراتی قسم کے مضامین کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔

مضمون میں خیالات کا مرتب و منظم ہونا ضروری ہے۔ مضمون نگار کو چاہیے کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے، اُسے ترتیب و تنظیم سے پیش کرے۔ اگر خیالات منتشر یا منطقی ربط سے محروم ہوں گے تو مضمون مطلوبہ اثرات پیدا کرنے سے قاصر رہے گا۔ مضمون اور مقالے میں معمولی سافرق ہوتا ہے۔ مضمون مختصر ہوتا ہے جبکہ مقالہ طویل ہوتا ہے۔ مضمون میں موضوع کے اعتبار سے سادہ زبان بھی استعمال کی جاسکتی ہے اور بیان میں شکستگی بھی ہوتی ہے جبکہ مقالے میں سنجیدگی اور علمی وقار ہوتا ہے۔ مقالے میں مقالہ نگار اپنی تحقیق کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ اس لیے اس کا انداز تحقیقی اور عالمانہ ہوتا ہے۔ مضمون سطحی معلومات بہم پہنچاتا ہے جبکہ مقالے کے مضامین میں زیادہ گہرائی ہوتی ہے۔

اردو میں مضمون نگاری کا آغاز سر سید احمد خاں نے اپنے رسالے ”تہذیب الاخلاق“ سے کیا۔ اس رسالے نے سر سید کے علاوہ شبلی، نذیر احمد، مولوی چراغ علی، محسن الملک اور وقار الملک جیسے مضمون نگار پیدا کیے۔ ان کے بعد کے مضمون نگاروں میں مولوی عبدالحق، فرحت اللہ بیگ، سر عبدالقادر، عبدالحلیم شرار اور حافظ محمود شیرانی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جدید دور کے مضمون نگاروں میں ڈاکٹر سید عبداللہ سید وقار عظیم، ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور ڈاکٹر وزیر آغا کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔